ڈاکٹر شبنم نیاز
استاد شعبہ اردو، لاہور کالج برائے خواتین، لاہور
ڈاکٹر محمد افضال بٹ
استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

عصری غزل میں سماجی اقدار اور رُجحانات کا احیاء

(کلاسیکی غزل کے تناظر میں)

Dr. Shabnam Niaz
Assistant Professor, Lahore College for Women University, Lahore.
Dr. Muhammad Afzal Butt
Associate Professor, Govt. Women University, Sialkot

The Revival of Trends and Social Values of the Contemporary Ghazal in the Perspective of Classical Ghazal

This article talks about the literature of every era under the ever changing influence of civilization and society. The revival of trends and social values exist accidents or mishaps of the period may decrease their importance but they cannot uproot them. In classical and contemporary Ghazal the revival and continuity of topics, trends and social values can be seen clearly in contemporary Ghazal like classical Ghazal's era also deeply influence by the changing trends of the era. Now under the influence of new trends and ever changing thoughts the preference is given to observation too. We see the new trends and topics of contemporary Ghazal are being reformed by the same resultant same social issues or conditions which are found in the classical Ghazal.

Keywords: *Revival of trends, social values, perspective, influence, preference, decrease.*

ہر عہد کا ادب معاشرے کی بدلتی تہذیب اور روایت کے زیر اثر تبدیل ہوتا ہے۔ معاشرتی اقدار اور رجحانات کا احیاء بنتی مٹتی تہذیب کی وجہ سے بدلتا تو ہے مگر ختم نہیں ہوتا اس کی اہمیت کلاسیکی اور عصرِ حاضر میں کم نہیں ہوتی۔ قدیم اور جدید غزل میں معاشرتی اقدار اور رجحانات کا احیاء و تسلسل صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ کلاسیکی غزل کی

طرح عصرِ حاضر کی غزل بھی اپنے دور کی روایات اور معاشرتی اقدار سے متاثر ہوئی فرق صرف اتنا ہے کہ ماضی میں شاعری میں جذبات و احساسات کو اہمیت دی جاتی تھی لیکن اب نئے رجحانات اور ہر لمحہ بدلتی ہوئی سوچ کے زیرِ اثر مشاہدے کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عصرِ حاضر کی غزلوں کے رجحانات اور موضوعات بھی اسی طرح معاشرتی حالات کے تابع ہیں جیسے کہ کلاسیکی دور کی غزلوں میں تھے یہ مقالہ دورِ حاضر کی غزلوں میں کلاسیکل غزلوں کی روایات اور موضوعات کے تسلسل کے احیاء کا تقابلی جائزہ پیش کرے گا۔

غزل فارسی زبان کی پیداوار ہے جسے اُردو شعراء نے تازگی، ندرت اور حسن بخشا۔ خیالات کی ندرت، موضوعات کی آفاقیت، انفرادیت اور اجتماعیت معاشرتی تبدیلیوں نے اس کے خدوخال سنوارے۔ اس طرح غزل اُردو شاعری کی ایک اہم، مقبول اور محبوب صنف بن گئی۔ محبوب اس طرح سے کہ اس صنفِ سخن میں شاعر اپنی دلی کیفیات اور حالات کو آسانی سے بیان کرتا ہے اور مقبول اس حوالے سے کہ غزل مختصر ہونے کے باوجود جامعیت رکھتی ہے یہ خوبی شاعری کی کسی اور صنف میں کم دکھائی دیتی ہے۔ انسانی جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے شعری اصناف میں بہترین ذریعہ غزل ہے۔ غزل کی ساخت میں اتنی لچک اور گنجائش ہے کہ یہ ہر قسم کے جذبے کے اظہار کے لیے معتبر اور مستند ہے۔

ڈاکٹر وقار احمد رضوی لکھتے ہیں:

> "غزل کو اپنانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ تصور کی لطافتوں، باریکیوں اور نزاکتوں کا بار اٹھانے کے قابل تھی اور اس میں اس قدر صلاحیت تھی کہ شعراء اپنے مافی الضمیر کو اس کے ذریعے ادا کر سکیں۔ اس لحاظ سے غزل انسان کی تاریخی ضرورت بن کر آئی۔"(۱)

ایسی شاعری جو مستند روایت کی حامل ہو وہ ہر عہد کے شعراء کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ جس کی تقلید کی جاتی ہے اور یہ نئے رجحانات کا تعین بھی کرتی ہے۔ ہر عہد کی شاعری کے موضوعات اپنے سماجی رجحانات سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ کلاسیکی غزل کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی اپنے عہد کے سماجی حالات سے متاثر رہی ہے اور ان کے زیرِ اثر کلاسیکی شعراء کی غزلوں کے رجحانات اپنے عہد کے مطابق نظر آتے ہیں۔ کلاسیکیت کو رومانیت کی ضد کہا جاتا ہے اور اپنی اپنی جگہ یہ دو متضاد ادبی رجحانات سمجھے جاتے ہیں۔ دنیا کی تمام زبانوں کے شعر و ادب میں یہ دونوں رجحانات موجود رہے ہیں۔ جس عہد میں شعر و ادب پر کلاسیکیت کا رجحان غالب رہا اسے کلاسیکی اور جس عہد میں شعر و ادب پر رومانیت کا غلبہ رہا اسے رومانوی دور کہا جاتا ہے۔

کلاسیکیت کی بنیاد تقلید ہے عصرِ حاضر میں کلاسیکیت کو ان فنی عناصر کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے جس کا التزام قدیم تحریروں میں کیا جاتا ہے۔ قدیم راسخ طریقوں کی پیروی کرنا کلاسیکیت ہے۔ اُردو شعر و ادب میں جو صنف

آفاقیت، انفرادیت اور سند کا درجہ رکھتی ہو وہ کلاسیک کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور ہماری غزل میں یہ تمام خصائص پائے جاتے ہیں۔ جو عوامل اردو غزل کو یہ دوام بخشتے ہیں ان میں زبان و بیان، سماجی اقدار، موضوعات و رجحانات اور اندازِ فکر کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ یہ تمام عوامی روایات سے جڑے ہوئے ہیں ان کا تعلق معاشرے کے سماجی رجحانات سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> "غزل کی ہیئت نے بھی اپنے وسیع مفہوم میں نئے زمانوں کے نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہر دور میں اپنے آپ کو بدلا ہے اور ان حالات نے دوسری اصناف کی طرح اس میں بھی تجربات کے تسلسل کو جاری رکھا ہے۔ یہ تجربات چونکہ حالات کی پیداوار ہیں اس لیے یہ وقت کے ساتھ ساتھ غزل کی روایت کا جزو بنتے گئے ہیں۔" (۲)

ایک جامد صنفِ سخن ہونے کی وجہ سے غزل کی مخصوص ہیئت میں تبدیلی کی گنجائش نہیں اس کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل جامعیت کا حامل ہوتا ہے مگر پوری غزل کی کیفیت ایک ہوتی ہے۔ سوز و گداز، سلاست و روانی، آفاقیت اور لچک اس کی اہم خوبیاں ہیں اور اُردو شاعری کی دیگر اصناف کی طرح غزل بھی معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کا اثر قبول کرتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلاسیکی غزل سے عصرِ حاضر کی غزلوں میں ہمیں سماجی اقدار اور مختلف رجحانات کے احیاء کا تسلسل جاری و ساری دکھائی دیتا ہے۔

ہمارے جذبات اور تہذیبی رویوں کا بہترین اظہار اُردو شاعری خصوصاً غزل کی صورت میں ہوتا رہا ہے۔ اٹھارویں صدی کے انقلاب نے ہمارے شعری ورثے میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اس میں ہمیں جذباتی تنوع، جذبوں کی رنگارنگی اور سماجی حالات کے اثرات کے زیر اثر منفرد رجحانات بھی ملتے ہیں۔ کلاسیکیت اور نئے رجحانات اپنی اپنی جگہ ایک منفرد تجربہ بھی رہے۔ ایک دوسرے سے متصادم بھی رہے اور ایک بہترین امتزاج بھی۔ یہ تینوں مل کر بہترین کلاسک کا درجہ اختیار کر رہے تھے بالکل اسی طرح میر و سودا، غالب و مومن، انشاء و ناسخ اور درد و ذوق جیسے شعراء کی تقلید آج بھی جاری ہے۔ اردو شاعری میں ریختہ سے مراد وہ کلام تھا جو فارسی اور ہندی کے تال میل سے وجود میں آیا تھا جسے غزل کا ابتدائی نمونہ کہا جاتا ہے۔ غزل چونکہ فارسی زبان کی پیداوار ہے جیسے اردو زبان نے بڑی فراخدلی سے اپنایا جس کی وجہ سے اس پر فارسی زبان کے اثرات نمایاں ہیں مگر ہندوستانی تہذیب اور مقامی ماحول کی وجہ سے غزل نے اپنے طور پر ایک علیحدہ شناخت بنائی۔ امیر خسرو کو عام طور پر اردو زبان کا پہلا ریختہ گو کہا جاتا ہے ان کے کلام میں فارسی اور ہندی کی آمیزش ہے ان کی وفات کے بعد شمالی ہند میں غزل کے چند نمونے ملتے ہیں۔ غزل کی ابتداء دکن سے ہوئی۔ دکنی شعراء میں تقریباً تمام شعراء نے غزل لکھی۔ اس عہد کی غزلوں پر بھی فارسی زبان کے اثرات نمایاں

ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز الحق لکھتے ہیں:

"اُردو غزل نے اپنا سفر شمال سے شروع کیا تھا۔ اس کی پہلی سر زمین دکن تھی۔ دکن میں خوب پھلی پھولی اور ایک بار پھر شمال کا رخ کیا مگر اس دوران اس نے اپنے ارتقاء کی منزلیں طے کر لیں تھیں۔ اس امر کا اعتراف کر لیا گیا ہے کہ دکنی شعر و ادب شمال کے لیے نمونہ بنے۔" (۳)

قطب شاہی شعراء محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، غواصی اور شاہ سلطان جیسے شعراء کے یہاں غزلوں کے نمونے ملتے ہیں جن پر فارسی کے اثرات موجود ہیں۔ محمد قلی نے فارسی کے تتبع میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے اپنی کلیات کو مرتب کیا۔ دکنی دور کے مشتاق بیدری اور لطفی کی غزلوں میں غزل کی ابتدائی شکل نظر آتی ہے۔ اس عہد میں غزل میں فارسی کی تقلید کا رجحان غالب تھا۔ اور موضوعات سماجی اقدار کے تابع تھے۔

شمیم حنفی لکھتے ہیں:

"قطع نظر اس کے کہ اُردو غزل فارسی غزل کا ضمیمہ ہے اور اب اپنا علیحدہ تشخص رکھتی ہے اس میں شک نہیں کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی اور کسی حد تک بیسویں صدی کے دوران بھی، اُردو کے سب سے ممتاز شاعروں کی اکثریت نے بالعموم اس صنف کو آزمایا اور اسی کے واسطے سے اپنی پہچان بنائی۔ ولی اور سراج سے لے کر میر، سودا، درد، مصحفی، قائم بیدر اور آتش، غالب، مومن، ذوق اور ظفر کے بعد اس پامال صنف کی نشاۃِ ثانیہ کے دور تک، اُردو غزل کا طلسم ہمارے احساسات پر اور ہماری داخلی اور خارجی زندگی پر ہمیشہ حاوی رہا۔" (۴)

سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارویں صدی کے اوائل کے نمایاں غزل گو شعراء کی غزلوں میں فارسی غزل کے موضوعات اور رجحانات کا احیاء نظر آتا ہے۔ اس دور میں ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی نے غزل کی روایت کو آگے بڑھایا اس دور میں غزل کے موضوعات محدود تھے ولی نے غزل کے موضوعات کو وسعت دی اسے ایک نیا رنگ و آہنگ بخشا۔ اس عہد کے رجحانات روایتی تھے جس میں غزل گل و بلبل، معاملہ بندی اور تصنع و تکلف سے مزین تھی یہ رجحان اس معاشرے کی دین تھا جہاں غزل گو شعراء اس صنف میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ اس عہد کی غزلوں کے کچھ رنگ فارسی سے مستعار تھے اور باقی رنگ دکنی و شمالی تھے۔ ان کا امتزاج غزل کے لیے احیائے نو کا باعث ہوا۔

ولی دکنی ایسے ہی غزل گو شاعر ہیں جن کی غزل میں دکنی کے مقامی رنگ و آہنگ موجود ہیں اس میں دیسی الفاظ، فارسی تراکیب و محاورے اور تہذیب و تمدن کے عکس نمایاں ہیں ان کی غزلوں کے اکثر اشعار فارسی زبان کے زیرِ اثر بھی ہیں۔ ولی کی غزل کا یہ انداز بہت مختلف تھا جس سے شمالی ہند کے شعراء بہت متاثر ہوئے۔ ان کا کلام جب دلی پہنچا تو وہاں کے استاد شعراء نے بھی ولی کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا اور ولی کی غزلوں کے ان رنگوں کو نہ صرف شمالی ہند بلکہ دلی کے شعراء نے بھی اپنایا۔ اس عہد کی غزل پر تصوف اور فلسفہ کا اثر بھی تھا۔ ولی کی غزل کا صوفیانہ رنگ نہ صرف منفرد تھا بلکہ اس میں اس عہد کی عکاسی بھی ملتی ہے۔

ولی لکھتے ہیں:

؎ گر ہوا ہے طالب آزادگی
بند مت ہو سبحہ و زنار کا (۵)

دکن اور شمال کی طرف سفر کرتی اس غزل نے ایک سے زیادہ طرز و اسلوب اپنائے۔ ان غزلوں پر کیفیت، مضمون آفرینی، معاملہ بندی اور خیالات کی ندرت چھائی نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی کے کلام میں مشکل پسندی اور کسی کے ہاں سادگی و سلاست نظر آتی ہے۔ یہ دونوں طرز تحریر سماج و معاشرے اور ذاتی کیفیات کے تابع نظر آتی ہیں۔ ولی کی طرح سراج اورنگ آبادی اور شاہ حاتم کے کلام میں بھی یہی رجحان ملتا ہے۔ ان کی غزلوں پر بھی دکنی رنگ غالب ہے۔ شاہ حاتم بھی صوفیانہ اثرات کے تابع غزل لکھ رہے تھے۔

شاہ حاتم لکھتے ہیں:

؎ کچھ دور نہیں منزل ، اٹھ باندھ کمر حاتم
تجھ کو تو چلنا ہے کیا پوچھے ہے راہی سے (۶)

عشق کے یہ معجزے ہمیں ہر عہد کی غزل میں اعجاز دکھاتے نظر آتے ہیں پھر وہ چاہے ولی ہو، میر ہو غالب ہو، اقبال ہو یا ناصر کاظمی۔ یہ جذبہ اور رجحان ہر عہد کی غزل میں توانا رہا۔ عشق کی جنوں خیزیاں اسلوب کی ندرت میں ڈھل کر ہر عہد کی غزل میں جلوہ فرما رہی۔ عشق کی کیفیات کو مبالغے کی حد تک شعراء نے بیان کیا ہے۔ عشق بھی ایک طرح سے مقامی حالات کی وجہ سے شاعری کا حصہ بنا۔ اس عہد میں غزل پر مقامی اثرات کی آمیزش موجود تھی۔ غزل میں عشق کے موضوعات کو برتنے کے رجحان نے دلی میں ایہام گوئی کو فروغ دیا اس سلسلے میں آبرو، حاتم، مضمون، شاکر ناجی اور یکرنگ کے نام بہت اہم ہیں۔ البتہ ولی اس رنگ تغزل سے دور ہی رہے۔ ایہام گوئی میں مضمون کا رنگ بہت نمایاں ہے۔

کیا خوب کہتے ہیں:

؎ بند شیشے میں بھی کیا ہے تو بھی پھڑکاتی ہے آنکھ
دخترِ رز کی نہیں جاتی ہر گز تاک جھانک (۷)

ایہام اور مبالغے کے یہ رنگ بھی اس عہد کی تہذیب کی عطاء تھے مگر بدلتے ہوئے رجحانات اور حالات کے زیرِ اثر ایہام گوئی کا یہ رنگ جلد ہی مدہم ہو گیا۔ رفتہ رفتہ غزل میں جذبات، احساسات اور ہجر و وصال کے رنگ نمایاں ہونے لگے اور غزل کا نمایاں موضوع عشق ہی رہا۔

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"اٹھارویں صدی کے آغاز میں جب اُردو کا مرکز جنوب سے شمال کو منتقل ہوا تو نظم کے مقابلے میں غزل کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی اس کی وجہ تخیّل کا وہ ہیجان تھا جو دلی کی فضاء میں موجود تھا اور جو غزل کے فروغ کے لیے نہایت ساز گار ثابت ہوا۔" (۸)

عشق، ایہام اور پھر عشق کے ساتھ ہمیں تصوف کی صوفیانہ سوچ بھی غزل میں ملتی ہے۔ ان شعراء کی غزلوں میں موت و حیات کا فلسفہ، بے ثباتی کائنات اور بے یقینی کی کیفیات کا بیان بھی ملتا ہے۔ آبرو جیسے روایتی غزل گو شاعر کے ہاں ہمیں مذہبی رجحان بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس وقت لوگوں کے اذہان تصوف کے زیرِ اثر بے ثباتی کائنات کے مضامین کے بارے میں الجھے ہوئے تھے۔ عشق مجازی اور عشقِ حقیقی کی بحثوں کے بیچ موت، تصوف، تصور فنا اور بقا جیسے مضامین امیر خسرو کے کلام سے ولی تک برتے گئے۔ اس عہد میں لوگ کائنات اور ذات کی فنا کے بارے میں مباحث کرتے تھے۔

صوفیاء کرام کی شاعری میں بھی یہی رجحان غالب تھے۔ یہاں تک کہ ایہام گو شعراء کی غزلوں میں بھی تصوف، موت اور مذہب جیسے سنجیدہ موضوعات کو برتا گیا۔ سراج اورنگ آبادی اپنی غزل کے ایک سنجیدہ شعر میں ذو معنویت میں حقیقی و مجازی عشق اور فلسفہ ہائے زندگی کے مضمون کو بڑی عمدگی سے باندھتے ہیں۔

لکھتے ہیں:

؎ شہِ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی (۹)

غزل جب دلی پہنچی تو اس کو بہترین قدر داں ملے جنھوں نے غزل کو مقبولیت اور معیار کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ غزل نہ صرف مقبول ہوئی بلکہ اپنی شناخت بنانے میں بھی کامیاب ہوئی۔ میر و سودا نے غزل کو اعتبار بخشا اور ذوق، غالب اور مومن جیسے شعراء نے غزل کو معنوی فکر اور پختگی اسلوب کی بلندیوں پر پہنچایا۔ بنیادی طور پر اٹھارویں صدی

میں غزل نے بڑی ترقی کی اس زمانے کو اُردو غزل کا سنہرا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس عہد کے موضوعات، رجحانات اسلوب، زبان کی پختگی اور برجستگی نے اُردو غزل کو بڑی وسعت عطا کی۔ شمالی ہند سے دکن، دکن سے دلی، دلی سے شاہ حاتم اور شاہ حاتم سے میر و غالب تک اُردو غزل میں بڑے تجربات ہوئے۔

اس عہد میں ہندوستان نہایت پر آشوب دور سے گزر رہا تھا۔ جب میر کی غزلوں نے پہلے عشق، پھر شراب اور پھر مایوسی کا ذائقہ چکھا۔ میر کی غزلوں میں عشق اور معاملاتِ عشق کے ساتھ معاشرے میں پھیلا اضطراب، اور مایوسی دکھائی دیتی ہے۔ دلی اجڑنے اور ہندوستان کی سیاسی و سماجی صورتِ حال نے گل و بلبل کے استعاروں کو اجڑے دیاروں کے نوحوں میں بدل دیا۔ پھر یوں ہوا کہ شعراء کی غزلوں میں دل کا اجڑنا اور دلی کا اجڑنا ایک ہو گیا۔

میر کیا خوب لکھتے ہیں:

؎ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی (۱۰)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو ہندوستان کی تاریخ میں انقلاب آفریں عہد کی حیثیت حاصل ہے اس عہد میں جہاں اور بڑی سیاسی، سماجی اور معاشرتی تبدیلیاں ہوئیں وہیں اردو ادب بالخصوص اردو شاعری پر بھی بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ جنگ آزادی کے بعد شعر و ادب کی محفلیں اجڑ گئیں۔ دلی تاخت و تاراج ہوئی اور لکھنؤ ایک طویل عرصے تک شعر و ادب کا مرکز رہا۔ اس عہد کی غزلوں میں یاس، سادگی، واقعیت کے ساتھ کیف و مستی، تصنع، تکلف اور بناوٹ ملتی ہے۔ ہر دو بڑے رجحان ہیں۔ یاس، درد و غم، مایوسی اور فلسفہ اجڑی ہوئی دلی سے اور نشاط، کیف و مستی، تصنع اور بناوٹ لکھنؤ سے آئے۔

بے یقینی اور تصوف کے دو انتہائی خوبصورت اشعار کی مثال غالب کی غزلوں میں دیکھیے۔

غالب لکھتے ہیں:

؎ ہو چکی غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے (۱۱)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

؎ ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں (۱۲)

رنگِ میر، رنگِ حاتم اور رنگِ ولی ہمیں مصحفی اور مومن کے ہاں بھی نظر آتے ہیں۔ ان رنگوں میں دل کے ساتھ، تصوف اور عشق کے ساتھ معرفت کی شراب بھی ملتی ہے۔

مصحفی دیدار کی تڑپ اور عشق حقیقی کی طلب کو بہت منفرد انداز میں بیان کرتے ہیں۔
شعر دیکھیے:

؎ مصحفی رویتِ باری سے تُو نومید نہ ہو
روزِ محشر خبرِ وعدہِ دیدار گرم ہے (۱۳)

اسی طرح کی ایک کیفیت جس میں دل اور دُنیا کی کشمکش کو نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ مومن نے بیان کیا ہے۔ مومن فرماتے ہیں:

؎ کیا کسی بُت کے دل میں جگہ کی ، کوئی ٹھکانہ اور ملا
حضرتِ مومن اب تمھیں کچھ ہم مسجدِ میں کم پاتے ہیں (۱۴)

جگر مراد آبادی کا عہد ملی جلی تہذیب اور بنتے بگڑتے سماجی اقدار کا عکاس ہے اس میں بے فکروں نے عیش پرستی میں گم رہنے میں عافیت جانی اور عاشقوں نے جام و سُبو میں پناہ ڈھونڈھی حالانکہ یہ عہد بھی کچھ کم پُر آشوب نہ تھا۔ بے یقینی، یاس اور نا امیدی نے تمام ملک پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھے ایسے میں جگر جیسے شعراء گزشتہ سے پیوستہ رہتے ہوئے غزل میں تمام عوامل برت رہے تھے۔ ان میں تصوف اور حسن و عشق کے مضامین کے ساتھ میکدے بھی آباد تھے۔ ان میں غالب رجحان، مے نوشی، رندی اور مدہوشی کا تھا۔ سماج میں خمریات کی اجارہ داری اس عہد کی غزلوں میں بڑی واضح دکھائی دیتی ہیں مگر اس کے ساتھ مذہب کے ساتھ مضبوط تعلق بھی ملتا ہے۔ غزلوں میں جہاں مے اور میخانے کے مضامین ہیں وہیں تصوف اور مذہبی رجحانات بھی موجود ہیں۔
جگر لکھتے ہیں:

جب تو کچھ ظرف ہے اے دل ترے پیمانے کا
راز میخانے سے باہر نہ ہو مے خانے کا
عرصہِ حشر کہاں ، یہ دل برباد کہاں
وہ بھی چھوٹا سا ہے ٹکڑا اسی ویرانے کا (۱۵)

۱۸۵۷ء کی تباہ کاریوں نے نہ صرف ہندوستانی تہذیب و تمدن بلکہ ہندو مسلم ثقافت، زبان، مذہب اور تعلیم پر بھی ضرب لگائی۔ سماجی تنزلی اور انگریزی تعلیم کے مضمر اثرات کے متعلق مختلف شعراء نے اپنی غزلوں میں پیش کئے۔
اکبر الٰہ آبادی مغربی تہذیب اور تعلیمی پالیسی پر طنز کرتے ہوئے کیا خوب لکھتے ہیں:

؎ توپ کھسکی، پروفیسر پہنچے

جب بسولا ہٹا تو رندا ہے (۱۶)

ہے لباس اتحاد و دین و غیرت ایک لقمے ہیں

نئی تہذیب کا یہ پیٹ ہے یا رب کہ مٹکا ہے (۱۷)

۱۸۵۷ء کے بعد حالات میں استحکام آنا شروع ہوا اور لوگوں نے ذہنی طور پر تمام حالات کو قبول کرنا شروع کیا اس تبدیلی کا اثر شعر و ادب پر بھی ہوا۔ اُردو غزل کے حوالے سے غالب وہ شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے موضوعات میں وسعت اور تنوع کا آغاز کیا اور حالی وہ شاعر ہیں جنھوں نے غزل کی ہیئت میں وسعت پیدا کی۔ ابتداء میں حالیؔ نے بھی کلاسیکل غزل کے روایتی رنگ کو اپنایا ہے جس میں عشقِ حقیقی اور مجازی دونوں رنگ ملتے ہیں۔

یہ وہی رجحان ہے جو ہمیں شاہ حاتم، غالب اور جگر کے ہاں نظر آتا ہے۔ جلد ہی حالیؔ کے نظریات میں تبدیلی آئی اور جدت، آسانی اور مقصدیت نے ان کی غزلوں کو غیر روایتی عنصر دیا۔ انجمنِ پنجاب کے زیرِ اثر عشق کے روایتی کلاسیکی دائروں کی اسیر غزل حقائق کی دنیا سے آشنا ہوئی۔

۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک اور اس کے بعد کے عرصے میں اُردو شعر و ادب پر جو اثرات مرتب ہوئے انہوں نے اُردو غزل کو بھی بہت کچھ دیا۔ اس عہد کے غزل گو شعراء کے ہاں جو بے اطمینانی، مایوسی، احتجاج، تاسف یا طنز نظر آتا ہے وہ تقسیم ہند کی ہنگامہ خیزیوں کا نتیجہ ہے جس طرح میرؔ و غالبؔ اور ظفرؔ کی غزلوں نے غمِ جاناں سے غمِ دوراں تک کا سفر طے کیا اسی طرح اکبرؔ سے اقبالؔ اور اقبالؔ سے ظفر اقبالؔ تک عصر حاضر میں لکھی جانے والی غزلوں میں بھی عصری مسائل اور اس عہد کے مخصوص رجحانات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے سماجی حالات اور مسائل بہت حد تک ایک جیسے تھے۔ زمین تقسیم ہو گئی تھی مگر زبان و بیان، حسیاتی شعور اور مسائل ایک جیسے رہے خاص طور پر پاکستان کے شعراء نے ان تمام سماجی عناصر اور اقدار کو نئے اسلوب میں اپنی غزلوں میں برتا۔

نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

> ”پاکستان کے وجود میں آتے ہی غزل کی مقبولیت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس مقبولیت کی بنیاد غزل کی اس صلاحیت پر تھی کہ غزل نئے حالات و حوادث کی عکاسی کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہوئی۔“ (۱۸)

بیسویں صدی وہ حیرت انگیز صدی ہے جو دنیا کی فکری، علمی اور عملی زندگیوں میں بے پناہ تغیر و تبدل لے کر آئی اس میں بہت حیرت انگیز انقلابات رونما ہوئے جس نے نہ صرف لوگوں کے اذہان کو تبدیل کیا بلکہ سماجی اقدار، ماحول اور علم و ادب کو بھی متاثر کیا۔ اس صدی میں جس تیزی سے ہماری اقدار، تہذیب، ماحول اور معاشرے میں تغیر

و تبدل آیا وہ اس سے پہلے نظر نہیں آتا۔ بیسویں صدی کا نصف اول بنیادی طور پر نظم کی بار آوری کا دور ہے مگر اس دور میں غزلیں بھی لکھی گئیں۔ داغؔ اور امیر مینائیؔ کی روایتی غزلوں کی بازگشت بھی تادیر سنائی دیتی رہی۔ جوشؔ، اخترؔ شیرانیؔ اور حفیظ جالندھریؔ بڑی عمدہ غزلیں لکھ رہے تھے جن میں روایت اور کلاسیکی غزل کا احیاء نمایاں ہے۔

ڈاکٹر ممتاز الحق لکھتے ہیں:

"انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں غزل کے دو رنگ صاف دکھائی دیتے ہیں ایک تو وہ ہے جس میں تعقل پسندی، استدلال اور افادیت کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ اس رنگ کے علمبردار حالیؔ، اکبرؔ، چکبستؔ اور اقبالؔ ہیں۔ غزل کا دوسرا رنگ وہ ہے جس میں زندگی کے جذباتی اور جنسی پہلو کی عکاسی کی گئی ہے۔ داغؔ اور اس کے ساتھ شعراء کو ہم اس رنگ کا نمائندہ کہہ سکتے ہیں۔" (۱۹)

اس عہد میں بہت عمدہ غزل گو شعراء سامنے آئے جنھوں نے غزل کی زبان، آہنگ اور موضوع کے تنوع میں اپنا کردار ادا کیا۔ عصری تبدیلیاں علم و ادب پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں اس لیے اس عہد میں بھی شعراء نے خاص طور پر ان کا اثر قبول کیا ان کے کلام پر ان کے اپنے عہد اور کلاسیکی غزلوں کی مخصوص چھاپ نظر آتی ہے۔ تصوف اور مجاز کے یہ رنگ اقبالؔ کی غزلوں میں بھی بکھرے نظر آتے ہیں۔

اقبال رنگ داغ میں فرماتے ہیں:

؎ نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھا (۲۰)

انگریزی تہذیب، تعلیم اور یورپ کی اندھی تقلید کو بیان کرنے کے لیے رنگِ اکبر اختیار کرتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

؎ میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے (۲۱)

کئی جگہوں پر غالب کے اندازِ فکر، متصوفانہ انداز اور عالمِ خود فراموشی کو اختیار کرتے ہوئے عشقِ حقیقی کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

وہ فرماتے ہیں:

؎ کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں (۲۲)

یہ وہی عہدِ اقبال ہے جب ہمیں اقبال کے طرزِ فکر کو اپناتے ہوئے بہت سے غزل گو شعراء نظر آتے ہیں جنھوں نے غزل کے کینوس کو وسیع کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ ان میں حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی، یاس یگانہ اور فراق گورکھپوری کے نام اہم ہیں۔ ملکی حالات اور سیاسی مسائل پر حساس انسان بالخصوص ادیبوں کے اذہان پر اثر انداز ہوئے اس عہد کی غزلوں میں ہمیں زمانے کے عکس نمایاں ملتے ہیں۔ کچھ شعرا نے تغزل میں سیاسی رنگ کو بھی برقرار رکھا۔ ان میں حسرت موہانی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں پر ان کے عہد کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کی گہری جھلک نمایاں ہے۔ ان حالات میں حسرت کی غزلوں کا رومان سیاسی رنگ میں ڈھل جاتا ہے۔ حسرتؔ کی غزل کا ایک شعر ان رنگوں کی بڑی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔

حسرتؔ لکھتے ہیں:

؎ رسمِ جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حبِ وطن مستِ خواب دیکھیے کب تک رہے (۲۳)

قیامِ پاکستان کے بعد ملک کی کم و بیش وہی صورت حال تھی جو اورنگزیب عالمگیر کی وفات اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہند کے مسلمانوں کو درپیش تھی۔ ہمارے نامور شعراء جن کی غزلیں کلاسیکیت، فارسیت اور رومانویت کے امتزاج سے تخلیق ہوا کرتی تھیں وہیں شعراء بے یقینی و اندیشوں کا ذکر بیان کرنے لگے۔

حفیظ جالندھری ایک جگہ لکھتے ہیں:

؎ ہمیں ہر موڑ پر اک راہزن سے بچ کے چلنا ہے
کہ میں ہر موڑ پر اِک رہنما کو چھوڑ آیا ہوں (۲۴)

انجمن پنجاب لاہور کے مشاعروں کے بعد ہماری روایتی اُردو غزل ایک اور اہم تاریخی موڑ سے گزری جس کی وجہ سے غزل کا مزاج بہت تبدیل ہوا۔ ہماری غزل کے گل و بلبل، ساغر و مے اور گُلِ لالہ جیسے روایتی استعاروں کو سیاسی مفہوم عطا ہوا۔ شاعری کے روایتی استعاروں سے بغاوت نے غزل کو نئی معنویت عطا کی۔ یہاں غزل ایک طرف فنی اعتبار سے شاعری کو نئے مفاہیم عطا کرتی نظر آتی ہے تو دوسری طرف سماجی اقدار سے بغاوت کرتی ہوئی نئے رجحانات کی طرف مائل ہوتی ہے۔ یہ اہم تبدیلی پہلی جنگِ عظیم کے بعد پیدا ہونے والے حالات کے نتیجے میں قائم ہونے والی ترقی پسند تحریک کے زیر اثر آئی۔

خالد علوی لکھتے ہیں:

"دو دہائی قبل کی پاکستانی غزل چونکہ ایک مشترکہ تہذیبی ورثے کا زائیدہ تھی اس لیے سیاسی اور نظری تضادات کے باوجود مغائرت کی ایسی دیوار حائل نہ تھی کہ فکر و خیال کے

طائر بھی سرحد پار کرنے سے گریز کریں۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ برصغیر کی غزل نے کلاسیکی غزل سے رابطہ منقطع نہیں کیا تھا۔ اس لیے ہندو پاک کی غزلوں میں بہت سے عناصر مشترک تھے ترقی پسند غزل تو بہر حال ایک دستور کے تابع تھی اور یہ جبر ہندو پاک میں کم و بیش یکساں تھا اسی لیے تخلیقی عمل میں یکسانیت تھی۔ جدید غزل نے پاکستان میں بھی ہندوستان کی طرح بے چہرگی، بے دردی کے مناظر دیکھے وہاں بھی سورج پتھر جدید غزل میں مقبول تجربوں پر برستے رہے۔۔۔" (۲۵)

ترقی پسند تحریک اپنے دور کی مقبول ترین ادبی تحریک ہے جس کے زیر اثر اس عہد کے بڑے بڑے ادیب، شاعر، ناقدین اور افسانہ نگار سامنے آئے۔ ان شعراء میں فراق، فیض، مخدوم، جعفری، مجاز، جذبی، مجروح، احمد ندیم قاسمی، کیفی، جاں نثار اختر، عبدالحمید عدم، اختر الایمان، صوفی غلام مصطفی تبسم جیسے رجحان ساز شعراء شامل ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے غزل گو شعراء کی غزلوں میں سماجی اقدار کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ان شعراء نے ظلم و جبر، استحصال، نا انصافی اور ملکی سیاست کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔ یہاں اردو کی روایتی کلاسیکی غزل میں رومان اور سماجی تنزلی ایک دوسرے سے متصادم ہوتی نظر آتی ہے اور غزل احتجاج اور بغاوت کا رنگ اختیار کرتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

جانے کون رہزن ہیں ! جانے کون رہبر ہیں
گرد گرد چہرے ہیں آئینے مقدر ہیں
بیسویں صدی یہ کیسا انقلاب لائی ہے
کوہ پر ببولیں ہیں ، دشت میں صنوبر ہیں (۲۶)

یہیں مجاز کا رومان احتجاج اور بغاوت میں ڈھلتا ہے۔ تو سیاسی غزل وجود میں آتی ہے یہ وہ سماج ہے جو مجاز کو رومان کے رنگین مضمون سے آشنا کر رہا تھا اور اسی سماج نے اُسے دوشیزہ کے آنچل کو پرچم بنانے کی ترغیب دی۔

فیض احمد فیض کے سماجی حالات نے بھی اس کے ہاتھ سے گلاب لے کر کانٹے تھما دیئے۔ یہ جبراً اُسے احتجاجی راہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ متاعِ لوح و قلم چھن جانے پر خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر غزل لکھتا ہے۔

فیض احمد فیض زنداں نامہ میں جنوں اور خرد کی کشمکش کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

؎ نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے (۲۷)

سماجی اقدار کی تنزلی اور حالات نے رومان، عشق، تصوف اور فلسفے کے غزل گو شعراء کو بغاوت، احتجاج، طنز اور مایوسی تو

عطا کی مگر ہمارے شعراء نے غزل کی خوبصورتی کو کسی طور مجروح نہیں ہونے دیا۔ اسی احتجاج میں ہمیں فراق گورکھپوری کی غزلوں میں وہ رنگ نظر آتے ہیں جو روایتی شوخی اور کلاسیکیت کے رنگ ہیں۔ ان میں ہمیں روایتی غزلوں کا احیاء نظر آتا ہے۔

وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

ے نئے منصور ہیں صدیوں پرانے شیخ و قاضی ہیں
نہ فتوے کفر کے بدلے نہ عذرِ دار ہی بدلا (۲۸)

فاطمہ حسن اس بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"غمِ جاناں پر غمِ دوراں کا حاوی آ جانا ترقی پسند شعراء کا موضوع رہا۔ لیکن آج یہ بلا تخصیص ہر شاعر کے یہاں اپنے اپنے رنگ میں نظر آتا ہے۔ اب غزل صرف عشقیہ مضامین، داخلی واردات، اور محبوب سے گفتگو نہیں رہی۔ غمِ ہجرت، شہر آشوب، سماجی و سیاسی مسائل اور غمِ روزگار غزل میں بیان ہو رہے ہیں۔ اس صنف کا کمال یہ ہے کہ تلخ حقائق اس کے حُسن کو متاثر نہیں کرتے۔" (۲۹)

۱۹۴۷ء کے بعد اُردو روایتی غزل میں محبوب کی جگہ ملت اور سیاست بڑی کامیابی سے در آئی۔ غمِ جاناں سے غمِ دوراں کی طرف سفر اور پھر غمِ دوراں سے غمِ جاناں کی طرف مراجعت وقت کے گھومتے پہیوں کا استعارہ ہے دکھائی دیتے ہیں یہ غزل کا وہ روپ ہے جو روایتی عاشقانہ مفاہیم سے استغناء کرتے ہوئے سماجی عناصر میں ڈھل جاتی ہے۔ عصرِ حاضر کے جدید شعراء نے بھی کلاسکی غزلوں کے رجحانات کو اپنایا ہے۔ ان میں تصوف، فلسفہ، عشق، گل و بلبل کے استعاروں کے ساتھ احتجاج اور بغاوت بھی ملتی ہے اور کلاسیکی غزلوں کا آہنگ بھی۔

صابر ظفر کیا خوب لکھتے ہیں:

ان صبح و شام کو تو نگلتی ہے موت ہی
جو زندگی میں آنے سے ڈرتے ہیں صبح و شام
سینے پہ رکھ کے پاؤں گزر جائیں ورنہ یہ
جب دل میں سانس ہو تو ٹھہرتے ہیں صبح و شام (۳۰)

ڈاکٹر مسعود حسن خان لکھتے ہیں:

"عہدِ جدید کے تمام معاشرتی رجحانات کسی نہ کسی قسم کے اشتراکی سماج میں عوامی موسیقی کی طرح غنائی شاعری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ غزل بنیادی طور پر ایک فنکارانہ عمل

ہے۔ لیکن اس کے جذبات کی عمومیت مسلم ہے کیونکہ یہ عمومیت سرشتِ انسانی کی وحدت اور جبلتوں کی یکسانی پر مبنی ہے اور یہ عمومیت ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کا احاطہ کرتی ہے۔" (۳۱)

ہر عہد اپنے اندر تہذیبی شعور اور فکر و آگہی کا گہرا ادراک رکھتا ہے جس میں شعر و ادب کے چراغ روشن رہے ہیں۔ ان چراغوں کی روشنی بدلتے زمانوں کے زیرِ اثر کم یا زیادہ ضرور ہوتی ہے مگر ختم نہیں ہوتی۔ ان روشنیوں میں ہمیں قدیم و جدید شاعری کے حسین خال و خط آپس میں باہم مربوط دکھائی دیتے ہیں۔ خصوصاً اُردو غزل کے رجحانات کے احیاء و تسلسل اور تعمیر و ترقی کا یہ سلسلہ کسی ایک جگہ ختم نہیں ہوا بلکہ مسلسل جاری ہے۔

کلاسیکی غزلوں کا رومان ہو یا سن ستاون کا غدر ہماری آج کی غزل میں ان رجحانات کو برتا جاتا رہا ہے۔ اُردو کلاسیکی غزل نے عصرِ حاضر کی غزل کو تین نمایاں رجحانات دیئے جن میں تصوف، عشق اور زبان و بیان کی خوبصورتیاں شامل ہیں۔ ابتدائی غزلوں میں تصوف اور مسائل تصوف کا رجحان صوفیاء کرام کا مرہون منت ہے پھر روایتی شاعری میں عشق اور معاملاتِ عشق کی کارفرمائیاں جلوہ گر ہیں۔ زبان و بیان کی مشکل پسندی اور انفرادیت پسندی بھی سماجی رجحان کے زیرِ اثر غزلوں کا حصہ بنیں۔ اکبر کی وہ شاعری جو انگریزی تعلیم کے منفی پہلوؤں کے خلاف تھی اُن کا تتبع آج بھی جاری ہے۔ سید ضمیر جعفری انگریزی حکومت، مسلمانوں کے کردار، سیاسی حالات اور مغربی تہذیب و تعلیم پر بہت عمدہ بات کرتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

؎ علم وہ کیا جس سے زینے ذہن کے روشن نہ ہوں
جنگ میں بھی زنگ کھا جائے وہ تلوار کیا (۳۲)

عصرِ حاضر کے کئی شعراء کلاسیکی غزل کے روایتی کرداروں مثلاً زاہد، ملا، واعظ اور ناصح کو بھی آج کی غزلوں میں چوٹ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

حفیظ جالندھری:

؎ وہ آوازِ اذاں آئی ، مرا پیمانہ بھر ساقی
جنابِ شیخ چلیئے سوئے مسجد میں وضو کر لوں (۳۳)

محبوب اور رقابت کلاسیکی غزل کا حسن رہے ہیں اور ہر عہد میں یہ شعراء کا نمایاں رجحان رہا۔ عصرِ حاضر کے غزل گو شعراء کی غزلوں میں ترقی اور جدت نے علائم و رموز، تشبیہ او استعارے اور عشق و رقابت کو نئے انداز تو دیے

مگر مفہوم وہی روایتی غزلوں کے رہے۔ اپنی غزل میں محبت کی شدت اور محبوب کی بے اعتنائی کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

ظہیر کاشمیری لکھتے ہیں:

؎ کس کو ملا سراغ یہاں حسنِ یار کا
ہجر و وصال شعبدہ ہے اعتبار کا (۳۴)

روایتی غزل میں رقیب اور رقابت کی کھینچا تانی کا مضمون ہمیشہ سے کلاسیکی شعراء کا محبوب رہا ہے۔ اس روایت کو جدید غزل گو شعراء نے بھی اپنایا۔

ظفر اقبال لکھتے ہیں:

؎ اِک مصیبت سے نکل آؤں تو اس کی جانب
پھر کسی تازہ مصیبت کے لیے دیکھتا ہوں (۳۵)

ان مثالوں میں ہمیں غالبؔ کی غزلوں میں پیش کی گئی رقابت کا رنگ نظر آتا ہے۔ اسی طرح رنگِ میرؔ اور آہنگِ میرؔ کا تسلسل بھی جاری و ساری ہے۔ میرؔ کو دل اور دلی دونوں محبوب تھے ان کی غزلوں میں دل کی بربادی اور دلی کی بربادی کے نوحے کون بھول سکتا ہے۔ میرؔ دل کے نگر کو دوبارہ آباد ہونے کو ناممکن سمجھتے ہیں اور دلی شہر کو عالم میں ایک انتخاب قرار دیتے ہیں۔ میرؔ کی غزل کے یہ رنگ و آہنگ کئی جدید شعراء کے ہاں نظر آتے ہیں۔

ادا جعفری نے خوابوں اور عمارتوں کے بکھرنے کو اسی رنگ میں برتا ہے۔

؎ تم ایک خواب بکھرنے سے کیوں ہو آزردہ
کہ منہدم تو غموں سے عمارتیں بھی ہوئیں (۳۶)

ایک اور جگہ کیا خوب کہتی ہیں:

؎ امیر شہر کو آنسو کی بھیک تک نہ ملی
ہمارے عصر میں ایسی کرامتیں بھی ہوئیں (۳۷)

خواجہ میر دردؔ کلاسیکی غزل کے ایسے شاعر ہیں جو سارے جہاں کا درد محسوس کرتے ہیں اور دردؔ کا یہ درد آج تک محسوس کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح کسی اور پر خنجر چلتے دیکھ کر خود تڑپ جانے کی روایت بھی کلاسیکی غزل کا موضوع رہی یہ رجحان عصرِ حاضر کی غزلوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ جوشؔ کی غزل میں سماج کا درد کبھی کبھی ذاتی دکھ پر حاوی ہوتا نظر آتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

تسبیح و عمامہ و عبا و خاتم
تاج و اورنگ و قلعہ و چتر و علم
یہ جملہ عظیم قوتیں ایک طرف
اور ایک طرف طاقتِ سرکارِ قلم (۳۸)

ہماری کلاسیکی غزل کے شعراء زود رنج، حساس اور درد مند دل کے مالک تھے۔ عشق کی چوٹ کے گداز، ملکی حالات، مٹتی بگڑتی تہذیب کا غم اور کچھ اپنوں کی نارسائی بیان کرنے کا رجحان ان کی غزلوں میں موجود ہے۔ بے سروسامانی اور حوادث زمانہ سے ہر عہد میں لوگ نبرد آزما رہے ہیں۔ اور ان پر ادب کی ہر صنف میں بات ہوتی رہی ہے۔ روزگار اور سکون کی تلاش میں ہمارے بہت سے شعراء نے بھی ہجرت کی۔ اور اس کیفیت کو شاعری میں پیش کیا گیا۔ عصرِ حاضر کے بہت سے شعراء نے ان حالات کو اپنی غزلوں میں بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

شکیب جلالی لکھتے ہیں:

؎ وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت
میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت (۳۹)

بے سروسامانی اور بے بسی کی اس کیفیت کو بہت سے جدید شعراء اپنی غزلوں میں پیش کرتے ہیں۔

حبیب جالب کچھ ایسا ہی شکوہ کرتے نظر آتے ہیں:

؎ وہ جام بکف شام نہ وہ صحبتِ یاراں
جینے کے ترے شہر میں سامان کہاں ہیں (۴۰)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اُردو شاعری کے اس سارے تناظر میں عصرِ حاضر کی غزل میں کلاسیکی غزل کے رجحانات کا احیاء نظر آتا ہے۔ جیسے ولیؔ، سراج، میرؔ، غالبؔ، آتش اور ناسخ کے بعد اکبرؔ، اقبالؔ، داغ اور پھر فیض، حسرت، اختر الایمان، حفیظ جالندھری، حبیب جالبؔ اور مجازؔ لکھنوی نے بھی اپنایا۔ جس طرح ولیؔ دکنی کے دیوان نے اس عہد کے شعراء کی غزلوں کو وسعت، انفرادیت اور استحکام بخشا۔ نیا رنگ و آہنگ عطا کیا اسی طرح بیسویں صدی کے نصف اول کے شعراء نے بھی غزل میں سماجی اقدار اور رجحانات کو فکر کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

ڈاکٹر یوسف حسن خان لکھتے ہیں:

"شاعری نے دُنیا میں ہر جگہ لوگوں کو بدلتے شعور و احساس کا ساتھ دیا ہے تاکہ وہ ذہنی زندگی سے بے تعلق نہ ہو جائے غزل کا آرٹ بھی سکونی آرٹ نہیں کہ جہاں تھا وہیں

رہے۔ زندگی کی طرح وہ حرکت اور نمو میں رچا ہوا ہے اسی واسطے اس کی معنی آفرینیوں کی کوئی حد نہیں۔ علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ساتھ جوں جوں ذہن کی جلا بڑھے گی اس کا اثر ضرور ہے کہ ہمارے ااحساس و تخیل پر پڑے۔ جب احساس و تخیل متاثر ہوں گے تو غزل کے محرک بھی بدلیں گے اور اس کے رموز اور علامتوں کی توجیہہ بھی بدلے گی۔ اور اس طرح نئی نئی خیالی اور جذباتی حقیقتوں کی باز آفرینی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ گزشتہ دو سو سال کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ غزل کے بظاہر بندھے ٹکے علامتی لفظوں اور اشاروں میں معنی کی کس قدر وسعتیں پنہاں ہیں۔ ان کی دائمی جذباتی صداقتیں زمانے میں معنی اور لطف کے نئے نئے پہلو ہمارے سامنے پیش کرتی رہیں گی۔ یقین ہے کہ غزل نگاروں کی پرانے تجربوں کی نئی آگاہیاں آئندہ بھی تخلیق ہوتی رہیں گی اور اِس طرح ہمارے ادبی شعور کی نشو و نما جاری رہے گی۔" (۴۱)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عصرِ حاضر کے تمام شعراء کے یہاں غزل کے رسمی عناصر کے ساتھ واقعیت ملتی ہے جن میں سماجی و سیاسی مسائل پر زیادہ توجہ دی ہے ہے اور بغور دیکھا جائے تو یہ انھی سماجی اقدار اور رجحانات کی بازگشت ہے جو سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارویں صدی کے آغاز سے نظر آتے ہیں۔ تعلیم، ثقافت، ملت، قوم، جبر و تسلط، احتجاج، بغاوت، غصہ، رومان، عشق، تصوف فلسفہ کون سے ایسے رجحانات ہیں جو ہر عہد کے سماج میں موجود نہ تھے اس لیے کلاسیکی غزل سے عصرِ حاضر تک ان تمام مضامین میں وسعت آئی۔

عصری تبدیلیاں اور رجحانات زمانی بھی ہوتے ہیں اور ذہنی بھی۔ مضامین اور موضوعات میں وسعت بھی آ جاتی ہے۔ روایتی عشق سے مختلف ذات کے دائرے سے باہر غزل میں لا محدود کائناتوں سے اسیر ہونے کے تجربات آج بھی غزل میں ملتے ہیں۔

اُردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں کلاسیکی عہد سے تاحال ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور عصرِ حاضر کی غزل آج بھی میرؔ و غالبؔ کی غزلوں کی زلف کی اسیر ہے اور عہدِ کلاسیک آج بھی زندہ ہے۔ غزل کی وسعتوں کے بارے میں کیا خوب کہا گیا ہے:

؎ غزل اور تنگِ دامانی کا شکوہ
سلیقہ ہو تو گنجائش بڑی ہے

حوالہ جات

۱۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر۔ تاریخ جدید اُردو غزل، کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۸ء، ص ۲۵

۲۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر۔ غزل اور مطالعہ اُردو، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۵ء، ص ۶۱۱
۳۔ ممتاز الحق، ڈاکٹر۔ اُردو غزل کی روایت اور ترقی پسند تحریک، دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۱
۴۔ شمیم حنفی "اردو غزل میرؔ کے بعد" مشمولہ غزل عہد بہ عہد (مرتب) صدیق الرحمن قدوائی، پروفیسر، لاہور: دار الشعور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۱، ۲۲
۵۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر۔ ولی دکنی لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲
۶۔ ظہور الدین حاتم، دیوانِ حاتم (مرتب) پروفیسر بدالحق لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۶
۷۔ قیام الدین قائم چاند پوری۔ تذکرہ مخزنِ نکات (مرتب) پروفیسر ڈاکٹر اقتدار حسن، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اول، ۱۹۶۶ء، ص ۵۴
۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر۔ اردو شاعری کا مزاج، لاہور: مکتبہ عالیہ، (چھٹا ایڈیشن)، ۱۹۹۹ء، ص ۳۱۷
۹۔ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، طبع دوم، ۲۰۰۲ء، ص ۳۷۱
۱۰۔ میر، تقی میر۔ کلیاتِ میر، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص ۶
۱۱۔ میرزا غالب، دیوان غالب (نسخہ عرشی) ترتیب امیاز علی خان عرشی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۲ء، ص ۳۱۳
۱۲۔ ایضاً، ص ۳۱۲
۱۳۔ غلامی ہمدانی، مصحفی، کلیاتِ مصحفی (مرتبہ) نور الحسن نقوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵۲
۱۴۔ حکیم مومن خان مومن، کلیات مومن، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۵
۱۵۔ جگر مراد آبادی، کلیاتِ جگر، مرتب رانا خضر سلطان، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۰۶ء، ص ۱۶۶، ۱۶۷
۱۶۔ اکبر الٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر، کراچی: پنجاب پبلشرز، حصہ اول (س۔ن)، ص ۱۲۵
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۲۸
۱۸۔ نظیر صدیقی، جدید اردو غزل ایک مطالعہ، لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۴ء، ص ۴۴۰
۱۹۔ ممتاز الحق، ڈاکٹر۔ اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند تحریک، دہلی: ایضاً، ص ۱۳۷
۲۰۔ علامہ اقبال، ڈاکٹر۔ کلیاتِ اقبال، مشمولہ بانگِ درا، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰۸۔ ۱۲۴
۲۱۔ ایضاً، ص ۳۰۷۔ ۳۲۳
۲۲۔ ایضاً، ص ۲۹۶۔ ۳۱۲
۲۳۔ حسرت موہانی، کلیات حسرت، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۹

۲۴۔ حفیظ جالندھری ، کلیات حفیظ جالندھری (مرتب)، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۳۳

۲۵۔ خالد علوی "پاکستان کی غزل کے نئے رجحانات" مشمولہ غزل عہد بہ عہد (مرتب) پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، ایضاً، ص ۱۷۲

۲۶۔ احمد ندیم قاسمی، قاسمی کی غزلیں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۲۱۔۳۳۷

۲۷۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، لاہور: مکتبہ کارواں، س۔ن، ص ۴۹۔۲۳۹

۲۸۔ فراق گورکھپوری، کلیات فراق، مرتب مطرب نظامی لاہور: بک کارنر، ۲۰۱۴ء، ص ۱۳۵

۲۹۔ فاطمہ حسن "نئی غزل" مشمولہ غزل عہد بہ عہد (مرتب) پروفیسر صدیق الرحمن، ایضاً، ص ۱۳۷

۳۰۔ صابر ظفر، مذہب عشق، کراچی: رنگِ ادب، ۲۰۱۳ء، ص ۶۴۵

۳۱۔ مسعود حسن خان، ڈاکٹر۔ "غزل کا فن" مشمولہ اردو شاعری کا فنی ارتقاء (مرتبہ) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۸۵

۳۲۔ سید ضمیر جعفری، سرگوشیاں، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۳۲

۳۳۔ حفیظ جالندھری، کلیاتِ حفیظ جالندھری، ترتیت و تدوین ، خواجہ محمد زکریا، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۹

۳۴۔ ظہیر کاشمیری، کلیات ظہیر، عشق و انقلاب، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۳۶۰

۳۵۔ ظفر اقبال، کلیاتِ غزل اب تک جلد دوم، لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۱۱

۳۶۔ ادا جعفری، موسم موسم (کلیات) کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲ء، ص ۴۹۷

۳۷۔ ایضاً، ص ۵۰۷

۳۸۔ ہلال نقوی، جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۱۰۴

۳۹۔ شکیب جلالی، کلیات شکیب جلالی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۷۸

۴۰۔ حبیب جالب، کلیاتِ حبیب جالب، لاہور: طاہر سنز پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۲۹۹

۴۱۔ یوسف حسن خان، ڈاکٹر۔ اُردو غزل، لاہور: القمر انٹر پرائزز، ۱۹۵۲ء، ص ۱۰

References in Roman Script:

1. Waqar Ahmed Rizvi, Dr, Tareekh Jadeed Urdu Gazal, Karachi, National Book Foundation, 1988, Page 25.

2. Ebadat Barelvi, Dr, Ghazal or Mutalia Urdu, Aligarh Educational Book House, 2005, Page 611.
3. Mumtaz ul Haq, Dr. Urdu Ghazal ki Rivayat or Taraqi Pasand Tehreek Delhi, Educational Book House, 1999, Page 101.
4. Shamim Hanfi " Urdu Ghazal Mir k bad, Mashmoola Ghazal Ehd ba Ehd (Muratab) Siddiq ur Rehman Qadwaui, Professor, Lahore, Dar ul Shaoor 2015, Page 21,22
5. Gopi Chand Narang, Dr. Wali Dakni, Lahore, Sang Meel Publications, 2006, Page 12
6. Zahoor ud Din Hatim, Dewan e Hatim (Muratab) Prof.Bad ulHaq Lahore, Magrabi Pakistan Urdu Academy, 2010, Page 106.
7. Qiyam ud Din Qauim Chand Puri, Tazkira Mukhzan e Nukat (Muratab) Prof. Dr. Iqtidar Hassan, Lahore, Majlis Taraqi Adab Taba Awal 1966, Page 54.
8. Wazeer Agha, Dr, Urdu Shairi ka Mizaj, Lahore, Maktaba Aliya, (6th Edition), 1999, Page 317
9. Naseer ud Din Hashmi, Dakan Main Urdu, New Delhi, Qomi Council Baraey Farog Urdu Zuban, Taba Dom, 2002, Page 371.
10. Meer, Taqi Meer, Kuliyat e Meer, Lahore, Sang Meel Publications, 1987, Page 6
11. Mirza Ghalib, Dewan Ghalib (Nuskha Arshi) Tarteeb Imtiyaz Ali Khan Arshi, Lahore, Majlais Taraqi Adab, 1992, Page 313
12. Ibid, Page 312
13. Ghulam Hamdani, Mushafi , Kuliyat e Mushafi (Muratba) Noor ul Hassan Naqvi, Lahore, Majlis Taraqi Adab, 1983, Page 152
14. Hakeem Momin Khan Momin, Kuliyat e Momin, Lahore, Sang meel Publications, 2007, Page 115
15. Jigar Murad Abadi, Kuliyat Jigar, Muratab Rana Sultan, Lahore, Book Tak, 2006, Page 166-167
16. Akbar Ala Abadi, Kuliyat e Akbar, Karachi, Punjab Publishers, Hisa Awal (SN), Page 125
17. Ibid, Page 128
18. Nazeer Siddiqui, Jadid Urdu Ghazal ek Mutalia, Lahore, Globe Publishers, 1984, Page 440
19. Mumtaz ulHaq, Dr, Urdu Ghazal ki Riwayat or Taraqi Pasand Tehreek, Delhi, Aizan Page 137.

20. Allama Iqbal, Dr, Kuliyat e Iqbal, Mashmoola Bang e Dara Lahore, Iqbal Academy Pakistan, 2018, Page 108-124
21. Ibid, Page 307-323
22. Ibid, Page 296-312
23. Hasrat Mohani, Kuliyat Hasrat, Lahore, Khazina Ilm o Adab, 2004, Page 179.
24. Hafeez Jalandhari, Kuliyat Hafeez Jalandhari (Muratab) Dr. Khawaja Muhammad Zakriya, Lahore, Alhamd Publications, 2005, Page 33
25. Khalid Alvi, Pakistan ki Ghazal k naey rujhanat Mashmoola Ghazal ehad ba ehad (Muratab) Prof. Siddiq ur Rehman Qadwai, Ibid, Page 172.
26. Ahmed Nadim Qasmi, Qasmi ki Ghazlain, Lahore, Sang meel Publications, Page 21-337
27. Faiz Ahmed Faiz, Nuskha Haey Wafa, Maktaba Karwan, SN, Page 49-239
28. Firaq Gorakhpuri, Kuliyat Firaq, Muratab Mutrab Nizami, Lahore, Book Corner, 2014, Page 135
29. Fatima Hassan, Nai Ghazal, Mashmoola Ghazal Ehad ba Ehad (Muratab) Prof. Siddiq ur Rehman, Ibid, Page 137
30. Sabir Zafar Mazhab Ishaq, Karachi, Rang e Adab, 2013, Page 645
31. Masood Hassan Khan, Dr, Ghazal ka fan, Mashmoola Urdu Shairi ka Fani Irtiqa (Muratba) Dr. Farman Fateh Puri, Lahore, Alwaqar Publications, 2014, Page 85
32. Syed Zmeer Jafri, Sargoshian, Islamabad, Dost Publications, 1998, Page 32
33. Hafeez Jalandhari, Kuliyat Hafeez Jalandhari, Tarteeb wa Tadveen, Khawaja Muhammad Zakriya, Lahore, Alhamd Publications, 2005, Page 189.
34. Zaheer Kashmiri, Kuliyat Zaheer, Ishaq wa Inqilab, Lahore, Alhamd Publications, 1992, Page 360
35. Zafar Iqbal, Kuliyat e Ghazal Ab tak Jild Dom, Lahore, Multi Media Affairs, 2005, Page 1611
36. Ada Jafri, Mosam Mosam (Kuliyat) Karachi, Academy Bazyaft, 2002, Page 749
37. Ibid, Page 750
38. Hilal Naqvi, Josh Maleeh Abadi, Shaksiyat or Fun, Islamabad, Aademy Adbiyat Pakistan, 2007, Page 104

39. Shakeeb Jalali, Kuliyat Shakib Jalali, Lahore, Sang Meel Publications, 2004, Page 1278
40. Habib Jalib, Kuliyat e Jalib, Lahore, Tahir Sons Publishers, 2010, Page 299.
41. Yousaf Hassan Khan, Dr, Urdu Ghazal, Lahore, Alqamar Interprizers, 1952, Page 10.